جون ایلیا کی اردو غزل

(بہ حوالہ تصورِ مرگ و حیات)

صائمہ شمس

ABSTRACT:

In this article, personality of John Elia and his feelings & thoughts related to the concept of life and death, regarding Urdu Ghazal, have been analyzed. Incidents of personal life, stir the thoughts of John Elia, which affected the poet's point of view deeply. In this regard, selected examples have also been given that explain the concepts of poet.

جون ایلیا کی شخصیت بھی عجیب اور فکر بھی فکرِ عام سے جدا ہے۔ وہ زیادہ تر اس تشکیک کا شکار رہا، جس کو بے یقینی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسی بے یقینی، جو محض گمان کے بدلتے رنگوں کی اسیر ہے اور جس میں زندگی کے بارے میں کوئی بھی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔

زندگی کیا ہے میاں جان بھلا کیا کہیے
شاید اک اپنا سماں ہے تنہا ھُو یا ھُو [۱]

پڑے ہیں ایک گوشے میں گماں کے
بھلا ہم کیا، ہماری زندگی کیا [۲]

بے دلی کیا یونہی دن گزر جائیں گے
صرف زندہ رہے ہم تو مر جائیں گے [۳]

زندگی کے بارے میں ارتیابیت کا شکار ہونے والے کی داستان حیات میں بہت سے واقعات، بنیادی کڑیاں ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۸۶ء سے قبل دس برس تک بے خوابی کے عذاب سے گزرا اور دماغی دورے برداشت کیے۔ اس کیفیت نے زندگی سے فرار کی طرف مائل کیا۔ والد کی وصیت کہ ان کا کلام شایع کروانے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ

نہ ہو سکنے پر احساس جرم میں مبتلا رہا۔ امروہہ میں پیدا ہونے والے اس شاعر کا کہنا ہے کہ ان کے گھر میں سیاروں کا ذکر، گھر کے افراد کی طرح ہوتا تھا۔ عمر کے آٹھویں برس میں نرگسی انا کو، محبت سے دوچار کر کے شکست کا صدمہ سہنا پڑا۔ اس کو جون ایلیا نے ''ماجرا پرور سال'' کا نام دیا۔ مزید لکھا ہے کہ

> ''.....وہ دن ہفتے کے دنوں میں سے کوئی ایک دن تھا اور نہ مہینوں کے دنوں میں سے کوئی ایک دن۔ وہ دن تو سال کے تین سو پینسٹھ دنوں کے علاوہ ہی کوئی دن تھا۔ وہ تاریخ اور تقویم کا کوئی دن نہیں تھا۔ بلکہ زمان مطلق یا دہر (Absolutetime) کا کوئی دن تھا..... اگر زمان مطلق یا دہر کا کوئی دن فرض کیا جا سکتا ہو تو.....''[۴]

دن، مہینے، سال، تاریخ اور تقدیم سے ماورا ہو کر سوچنے والا زندگی کی مادی تعبیر سے بھی اس وقت گریز کرنے لگا جب اس نے برطانوی فلسفی بارکلے کی تصوریت پسندی کا مطالعہ کیا۔ بعد ازاں جون نے اعتراف کیا ہے کہ ہیوم کے مطالعہ نے نفس، روح اور ذہن کے متعلق بھی عقائد کو بہا دیا اور مابعد الطبیعیاتی انفعالیت اور تاریخیاتی انفعالیت نے ذہنی صورت حال ناسازگار کر دی۔ یقین سے محرومی نے کائنات پر ازل سے اٹھائے جانے والے سوالات یعنی اس کی توجیہہ کو غیر ضروری سمجھنے کا رجحان اور فکر پیدا کی، کائنات کی غایت کا سوال ہی اٹھا کر رکھ دیا۔

جون ایلیا کی لفظیات میں ذات، باطن اور وجود کی تکرار، دراصل اس کے کرب و ابتلائے حیات کا اظہار بن جاتے ہیں۔ وہ دنیا سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتا اس احساس محرومی اور احساس ندامت کی دو تصویریں پیش ہیں۔

ے نہیں رشتہ سمو چا زندگی سے
نہ جانے ہم میں ہے اپنی کمی کیا [۵]

ے ہم آہنگی نہیں دنیا سے تیری
تجھے اس پر ندامت ہے؟ نہیں تو [۶]

جون نے زندگی کو حساب کتاب یا قاعدے، قوانین کی جکڑ بندیوں سے آزاد رکھا اور سمجھا ہے۔ وہ اظہار محبت بھی کرتا ہے تو انوکھی طرز اپناتا ہے۔ محبوب کو دیکھ کر اپنا چہرہ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے اور افلاطونی محبت میں گرفتار، محبوب کے سامنے لقمہ چبانے کے عمل کو بھی ''ناشائستہ، غیر جمالیاتی اور بیہودہ'' گردانتا ہے اور بارہ سال کی عمر میں اپنی خیالی محبوبہ کو خط لکھتا ہے۔ وہ ڈرامے کی مخالفت محض اس بنا پر کرتا ہے کہ اس میں خیال کو ایک مخصوص کردار میں ''معین'' کر دیا جاتا ہے۔ نفی پسند (N,hilist) اور فوضوی (Anarchist) کسی بھی حکومتی ضابطے کو تسلیم نہ کرنے کا اقرار کھل کر کرتا ہے اور غزل کی زبان میں زندگی کو بھی، ان تمام مسلمات سے باہر سمجھتا اور جبر کی حیثیت دیتا ہے۔

ے تیرا ہر کام اب حساب سے ہے
بے حسابی کی زندگی کیا کی [۷]

ہم سے ہماری جنبش لب کا حساب کیا
ہے شکر جبر اور شکایت بھی جبر ہے [۸]

اس فکری تسلط نے شاعر کو وجود کے کرب میں مبتلا کر دیا جس کا اظہار وہ بارہا کرتا ہے:

جون یہ جو وجود ہے یہ وجود
کیا بنے گی اگر عدم نکلے [۹]

رہا میں شاہدِ تنہا نشینِ مسندِ غم!!
اور اپنے کرب انا سے غرض رکھی میں نے [۱۰]

بہت دشوار ہو جائے گا جینا
یہاں تو ذات کے اندر نہ رہیو [۱۱]

بیرون ذات کیسے ہے صدما جرا فروش
وہ اندرون ذات جو اندر ہے گم یہاں [۱۲]

ہیں صفحہ وجود پہ سطریں کھنچی ہوئی
دیوار پڑھ زیاں ہوں مگر در ہے گم یہاں [۱۳]

مستقل بولتا ہی رہتا ہوں
کتنا خاموش ہوں میں اندر سے

حجرۂ صد بلا ہے باطن ذات
خود کو تو کھینچیو نہ باہر سے [۱۴]

شہر آباد کر کے شہر کے لوگ
اپنے اندر بکھرتے جاتے ہیں [۱۵]

وہ اس کرب سے خلاصی پانا نہیں چاہتا:

''.....وہ نہ صرف جسمانی طور پر بیمار رہے ہیں بلکہ نفسیاتی طور پر بھی۔ شاعروں اور ادیبوں کے لیے نفسیاتی طور پر بیمار ہونا خسارے کی بات نہیں۔ جبھی تو جیمس جوائس نے ینگ سے اپنی نفسیاتی تحلیل کرانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس واقعے کو پڑھتے وقت مظفر علی سید کو مومن کا مصرع یاد آیا۔ ناصحا! ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہو گا۔ جوائس اور مومن کے ذہنوں کی یہ مماثلت حیرت انگیز ہے اور دونوں کی یہ سوچ حقیقت پر مبنی ہے کہ فنکار کی ذات اس کے درد و کرب سے عبارت ہوتی ہے۔ اگر اسے درد و کرب سے نجات دلا دی جائے تو پھر اس میں باقی کیا رہے گا''[۱۶]

جون ایلیا نے بھی اس درد و کرب کو حرز جاں بنائے رکھا۔

؎ جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے ۱۷

؎ خوش ہو سینے کی ان خراشوں پر
پھر تنفس کے یہ صلے بھی کہاں ۱۸

؎ زندگی کیا ہے اک ہنر کرنا
سو، قرینے سے زہر پیجئے گا ۱۹

؎ کیا ہے گر زندگی کا بس نہ چلا
زندگی کب کسی کے بس میں ہے ۲۰

عاشقانہ ذہن رکھنے والا جون، تصوریت پسندی کے زمانے میں، ایک عجیب و غریب خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ:

''تپ دق کی ''انقلابی بیماری'' جواں مرگی کی ایک جان پرور ضمانت تھی۔ میرا خیال یہ تھا کہ صرف دائیں بازو کے کانگریسی، مسلم لیگی احراری اور خاکسار نوجوان ہی طبعی عمر کو پہنچ کر وفات پانے کی ذلت برداشت کر سکتے ہیں..... کوئی انقلابی نوجوان یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے جواں مرگی میں ایک عجیب مرموز اور محزوں حسن محسوس ہوتا تھا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں عرفی کے حسن، اس کی قادر الکلامی اور جواں مرگی کا بہت ذکر ہوا کرتا تھا۔ ان تینوں چیزوں نے مل کر میری نظر میں عرفی کو جمال و کمال کا ایک بے مثال مظہر بنا دیا تھا۔ میں بھی اس زمانے میں جواں مرگی کی شدید آرزو رکھتا تھا۔ میری یہ آرزو تو پوری نہیں ہو سکی مگر حسن اتفاق سے پاکستان آنے کے بعد مجھے دق میں مبتلا ہونے کی لذت نصیب ہوگئی'' ۲۱

جون کی اردو غزل میں ''خون تھوکنے'' کا ذکر کئی ایک مقامات پر ہوا ہے۔ یہ اس کی جسمانی بیماری کا اشاریہ بھی ہے اور موت کی آرزو کا استعارہ بھی ہے:

؎ سوچا ہے کہ اب کار مسیحا نہ کریں گے
وہ خون بھی تھوکے گا تو پروا نہ کریں گے ۲۲

؎ رنگ ہر رنگ میں ہے داد طلب
خون تھوکوں تو واہ واہ کیجیے ۲۳

یہاں ''خون تھوکنے'' کی معنویت کثیر جہتی ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ زندگی کے حالات و واقعات کی تبدیلی کی مناسبت سے تراکیب کا پیرہن بھی بدلتا رہتا ہے۔ ''خونیں نفسی'' ہونا، ماہیت کے اعتبار سے خون اور پانی کا یکساں ہونا لیکن رنگت کے سبب خون کی فوقیت، اپنے آپ کو ''وقت کا خونِ رایگاں'' کہنا لیکن ''خشک لمحوں میں رچ جانا'' خود کو ''ہر زمانے کا سچ'' ثابت کرنے کے لیے ''نام کا خون میں تر بتر ہونا'' مژگاں کو رنگ کی ہوس ہونا اور دن خون

میں تر بتر گزارنا، ''ہنرمندِ رنگ ہونا'' اور ''خون تھوکنے کی داد پانا، خون تھوک کر رنگ میں رہنا اور خود کو ''ہنرمندِ اذیت'' بنا لینا وغیرہ میں ندرتِ خیال کی بھرپور تصویریں ابھرتی ہیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ حیات اور عصرِ حاضر کے تقاضے بھی خون مانگتے ہیں:

؎ پھینک دے اے حسین عصر! پھینک دے تیغ اور سپر
وقتِ نمازِ عصر ہے، خون سے تو وضو کرو ۲۴

اس مقام پر ''خون'' زندگی اور موت کی معنی خیزی کو اُجاگر کرتا ہے۔ ''لہو تھوک کر سنورنا'' اور ''داد پانا'' یا داد پانے کی طلب جون ایلیا کی شخصیت کا ایک حصہ ہے۔ انسانی تہذیب کے ارتقائی مراحل کا جائزہ لیا جائے تو انسانی ذہنی عوامل میں آرٹ اور رنگوں کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ آسٹریلوی باشندے اپنے ساتھ سرخ رنگ کا روغن لے کر پھرتے تھے تاکہ کثرت سے حسن کو سنوار سکیں۔ دشمنوں کو ڈرا سکیں اور عورتوں کو متاثر کر سکیں۔ متاثر ہونے اور متاثر کرنے کی خو جون ایلیا کی فکری زندگی کا خاصا ہے۔

جون ایلیا کے مجموعہ ہائے کلام کے نام ''گمان''، ''شاید اور لیکن'' قابل توجہ ہیں جو زندگی کے بارے میں شاعر کی نفسی پیچیدگی کا مظہر ہیں۔ زندگی کیا ہے؟ یہ سوال جون ایلیا کی اُردو غزل میں مختلف جوابات کے ساتھ ملتا ہے۔ مثلاً:

؎ نہ تو دل کا، نہ جاں کا دفتر ہے زندگی اِک زیاں کا دفتر ہے ۲۵
؎ زندگی کیا ہے، ایک کہانی ہے یہ کہانی نہیں سنانی ہے ۲۶
؎ لمحے لمحے کی نارسائی ہے زندگی حالتِ جدائی ہے ۲۷
؎ زندگی ہے داستاں افسوس کی میں ہوں میرِ داستاں، افسوس میں ۲۸

حیات کے حوالے سے جون ایلیا نے کاٹ دار لہجہ بھی استعمال کیا ہے اور گلہ مندی بھی ہے مثلاً شاعر کا کہنا ہے کہ زندگی کا سب سے پرامن واقعہ یہ ہے کہ آدمی، آدمی کو بھول گیا، دیوانے نے قہقہہ لگایا اور غمِ زندگی کو بھول گیا، زندگی کی دھوپ میں شباب مرجھا گیا تو بہار اور ابرِ بہار کا کیا فائدہ، زندگی لہولہان ہے لیکن تاحال رنگ بے خد و خال ہے نیز زندگی کا روزمرہ اور معمولاتِ حیات، شاعر کے لیے ایک عام انسان کی زندگی کی طرح قابل قبول نہیں۔ تین مثالیں پیش خدمت ہیں:

؎ روزمرہ ہے زندگی کا عجیب رات ہے اور نیند آنی ہے ۲۹
؎ کرب معمول کے مطابق ہے خواہشِ طولِ زندگی بھی سہی ۳۰
؎ اب میں بس رہ گیا ہوں راتوں کا مر گئے جون! مر گئے مرے دن ۳۱

دن، رات اور ماہ و سال، گلہ کرنے سے روکتا ہے۔ جسے زندگی کہا جاتا ہے وہ ایک ''پل'' بھی ہو سکتا ہے۔ شاعر اپنی تعمیرِ جان و مال کے لیے اپنی بنیاد ڈھانے کے لیے تیار ہے۔ عبث کا وجود، زندگی کی مراد پانے کے لیے ہے، زندگی خواب اور حقیقت کے درمیان نظر آتی ہے، کبھی وجود و عدم کے درمیان، کبھی ''جاگنے کی حالت کا خواب'' بن جاتی

ہے، کہیں وجود و عدم کے تضاد میں نظر آتی ہے۔ زندگی کی کم مہلتی بھی شاعر کو پریشان کرتی ہے:

؎ کیا سناؤں سرگزشتِ زندگی
اِک سرائے میں تھا میں ٹھہرا ہوا ۳۲

؎ دِل کی یہ ہار بھی تو ایک طور ہے زندگی کا یار
یوں بھی ہے دِل خود اپنی ہار، ہار کی ہار کیا بھلا

؎ ہے یہ قرارگاہ بُود، ایک فرارِ صد نمود
اس میں قرار کیا بھلا، اس میں فرار کیا بھلا ۳۳

مذکورہ بالا آخری شعر میں بھی موت و حیات کے تصادم کی فضا قائم ہے۔ ''ہائے جمال احسانی'' کے زیرِعنوان نظم میں زندگی اور موت کے بارے میں آخری چار مسلسل اشعار کا حوالہ بے جا نہ ہوگا جن میں جون ایلیا نے زندگی کو شدید جذباتی سطح پر اور موت کو ایک تلخ حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے:

؎ زندگی کیا ہے؟ صرف ایک ٹھٹول — اس کو میزانِ فکر میں نہ تول
موت ہے اور ہوس خرید کی ہے — اور کچھ بھی نہیں یہاں انمول
ہے اگر سوچنا تو مت کچھ سوچ — ہے اگر بولنا تو کچھ مت بول
لمحہ لمحہ پڑھا کرے انسان — نوحہء کُل من علیھا فان ۳۴

''لیکن'' میں شامل ''شہر بگولوں کا ہے'' ردیف کی حامل ایک غزل پوری کی پوری، جون ایلیا کے انہی تصورات کی توضیح ہے۔

زندگی کی بے رونقی اور مرنے والوں کی بے خبری کا افسوس یوں کیا ہے:

؎ وہ جو اپنی جاں سے گزر گئے انہیں کیا خبر ہے کہ شہر میں
کسی جاں نثار کا ذکر کیا کوئی سوگوار بھی اب نہیں ۳۵

شاعر کو مرنے کے بعد اہل دنیا کی توجہ کا مرکز بننا پسند ہے۔ مُردہ پرستی کی روایت کا مظہر یہ شعر ملاحظہ ہو:

؎ ہو گا جس دن فنا سے اپنا وصال
ہم نہایت سجائے جائیں گے ۳۶

اسے یہ بھی احساس ہے کہ ایک فرد کی موت سے، زندگی کا سلسلہ رکتا نہیں:

؎ میرا سانس اکھڑتے ہی سب بین کریں گے، روئیں گے
یعنی، میرے بعد بھی یعنی، سانس لیے جاتے ہوں گے'' ۳۷

آخر جون ایلیا نے محسوس کیا کہ فلسفہ نہیں بلکہ شاعری آنے والے کل کی امید دلاتی ہے۔ ''موت'' بھی اس کے لیے مستقبل کی نوید اور زندگی کا تسلسل ہے۔

حوالہ جات:

(۱) جون ایلیا، یعنی ، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۱۲
(۲) ایضاً، ص ۵۷
(۳) جون ایلیا، شاید (لاریب پیکیجز) کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۳۷
(۴) جون ایلیا، نیاز مندانہ (مشمولہ: شاید) ص ۷
(۵) جون ایلیا، یعنی، ص ۶۷
(۶) ایضاً ، ص ۱۲۹
(۷) ایضاً ، ص ۱۶
(۸) ایضاً ، ص ۴۲
(۹) ایضاً ، ص ۱۳۰
(۱۰) جون ایلیا، شاید، ص ۶۴
(۱۱) ایضاً ، ص ۱۲۱
(۱۲) ایضاً ، ص ۱۳۲
(۱۳) ایضاً ، ص ۱۳۳
(۱۴) ایضاً ، ص ۱۸۴
(۱۵) ایضاً ، ص ۲۶۱
(۱۶) پروفیسر نظیر صدیقی، ادبی جائزے (۲، تبصرے .....۱۰ شاید ..... جون ایلیا) الوقار پبلی کیشنز، لاہو، ر ۱۹۹۷ء، ص ۱۴۲، ۱۴۳
(۱۷) جون ایلیا، یعنی، ص ۲۶۔
(۱۸) ایضاً ، ص ۵۴
(۱۹) ایضاً ، ص ۸۵
(۲۰) جون ایلیا، شاید، ص ۲۵۴
(۲۱) جون ایلیا، نیاز مندانہ (مشمولہ: شاید) ص ۹
(۲۲) جون ایلیا، شاید، ص ۹۳
(۲۳) ایضاً ، ص ۱۰۸
(۲۴) جون ایلیا، لیکن، الحمد پبلی کیشنز، لاہور: (اشاعت سوم) جنوری ۲۰۱۰ء، ص ۲۲۶
(۲۵) ایضاً ، ص ۳۷
(۲۶) ایضاً ، ص ۱۴۳
(۲۷) ایضاً ، ص ۲۰۱
(۲۸) ایضاً ، ص ۲۴۶

(۲۹) ایضاً ، ص۱۴۲
(۳۰) ایضاً ، ص۱۸۷
(۳۱) ایضاً ، ص۲۰۰
(۳۲) ایضاً ، ص۱۰۵
(۳۳) ایضاً ، ص۶۹
(۳۴) ایضاً ، ص۵۱-۵۲
(۳۵) جون ایلیا، شاید،ص ۱۶۷
(۳۶) جون ایلیا، یعنی ،ص۵۳
(۳۷) ایضاً ، ص۱۴۰